رسائل و مسائل

پوسٹ مارٹم اور دیگر طبی مسائل

سوال:۔ سابق خط کے جواب[1] سے میری تشفی نہیں ہوئی۔ آپ نے لکھا ہے کہ "پوسٹ مارٹم کی ضرورت بھی مسلّم ہے اور احکامِ شرعیہ میں شدید ضرورت کے بغیر اس کی گنجائش بھی نظر نہیں آتی"۔ مگر مشکل یہ ہے کہ طبی نقطۂ نگاہ سے کم از کم اس مریض کی لاش کا پوسٹ مارٹم تو ضرور ہونا چاہیے جس کے مرض کی تشخیص نہ ہو سکی ہو یا ہونے کے باوجود علاج بیکار ثابت ہوا ہو۔ اسی طرح "طبی قانونی" (Medico-legal) نقطۂ نظر سے بھی نوعیتِ جرم کی تشخیص کے لیے پوسٹ مارٹم لازمی ہے۔ علاوہ ازیں اناٹومی، فزیالوجی اور آپریٹیو سرجری کی تعلیم بھی جسدِ انسانی کے بغیر ناممکن ہے۔ آپ واضح فرمائیں کہ ان صورتوں پر شرعاً شدید ضرورت کا اطلاق ہو سکتا ہے یا نہیں؟

آپ نے ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ "آج کل الکوہل کو ایک اچھا محلل ہونے کی حیثیت سے دواسازی میں استعمال کیا جاتا ہے، لیکن جب فنِ دواسازی کو مسلمان بنایا جائے گا تو الکوہل کے استعمال کو ترک کر دیا جائے گا"۔ لیکن کیمیاوی اصطلاح میں الکوہل کے لفظ کا اطلاق صرف نشہ آور اجزاء پر نہیں ہوتا، بلکہ یہ علمِ الکیمیا میں اشیاء کے ایک خاص گروپ کا نام ہے جس میں مُسکرات کے علاوہ اور بہت سی چیزیں شامل ہیں، تو کیا پھر ان سب اشیاء کا استعمال ناجائز ہوگا؟ علاوہ ازیں الکوہل کا جسم پر خارجی استعمال بھی ہوتا ہے، کیونکہ وہ صرف محلل ہی نہیں بلکہ جراثیم کش بھی ہے۔ کیا یہ استعمال بھی ممنوع ہے؟

تفہیم القرآن میں آپ نے ایک مقام پر یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمان اطبا دواسازی میں الکوہل

[1] سائل کا پچھلا خط اور اس کا جواب ترجمان القرآن بابت ماہ اپریل و مئی ۱۹۵۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔

کے بجائے شہد استعمال کرتے تھے۔ نیز آپ نے وہاں یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ شہد کی مکھی کو خاص جڑی بوٹیوں سے رس حاصل کرنے کی تربیت دے کر اُس سے دوا سازی میں مدد لی جا سکتی ہے۔ ترقی فن کے موجودہ دور میں آپ کا شہد کو الکوہل کا بدل تجویز کرنا اور شہد کی مکھی کی تربیت کا مشورہ دینا میری سمجھ میں نہیں آسکا ہے۔

اب میں مختصراً چند سوالات عرض کرتا ہوں، جن کے جوابات کی ضرورت ہے:۔

۱۔ کسی مریض کی جان بچانے کے لیے اُس کے جسم میں خون داخل کرنا بعض علماء کے نزدیک ناجائز ہے۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

۲۔ بعض دواؤں کے اجزاء انسانی یا حیوانی پیشاب، خون یا گوشت سے حاصل کیے جاتے ہیں، اور بعض دوائیں وہیل مچھلی کے غدود سے نکالی جاتی ہیں۔ ایسی دواؤں کا استعمال شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

۳۔ ڈاکٹر کے لیے فیس کا تعین یا اُس کا مطالبہ جائز ہے یا اسے مریض کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہیے۔؟

۴۔ سائنس کے مختلف شعبوں کے مطالعہ کرنے کے سلسلے میں اسلام کیا رہنمائی دیتا ہے؟

۵۔ غذاؤں اور دواؤں کی حلت و حرمت کے بارے میں شرعی احکام کیا ہیں؟

۶۔ مسلم اطبائے طب کو اسلام کا پابند بنانے کے سلسلے میں کیا خدمات سرانجام دی ہیں؟

جواب:۔ (۱) پوسٹ مارٹم کے مسئلے میں، جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، مجھے خود بڑا خلجان ہے اور کوئی فیصلہ کن بات کہنا میرے لیے مشکل ہے۔ اس معاملے کے دو مختلف پہلو ہیں جن کے تقاضے ایک دوسرے سے متصادم ہوتے ہیں۔

ایک طرف شرعی احکام ہیں جو مرنے والے انسانوں کے جسم کا احترام کرنے اور ان کو عزت کے ساتھ دفن کر دینے کی تاکید کرتے ہیں، اور اگر وہ مسلمان ہوں تو ان کی تجہیز و تکفین کر کے نماز جنازہ پڑھنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ ان شرعی احکام کی تائید اُن لطیف انسانی حسیات سے بھی ہوتی ہے جو

(شاید ڈاکٹروں اور بالکل سائنٹسٹ قسم کے لوگوں کے سوا) سب ہی انسانوں میں موجود ہوتے ہیں۔ کوئی آدمی خوشی سے یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کے باپ، بھائی، بیٹے، بیوی، بہن اور ماں کی لاشیں ڈاکٹروں کے حوالے کی جائیں اور وہ اُن کی چیر پھاڑ کریں۔ یا وہ میڈیکل کالج کے طالب علموں کو دے دی جائیں تاکہ وہ ان کے ایک ایک عضو کا تجزیہ کریں اور پھر ان کی ہڈیاں سُکھا کر رکھ لیں۔ اسی طرح کوئی قوم بھی یہ گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اس کے لیڈر اور پیشوا مرنے کے بعد پوسٹ مارٹم کے تختۂ مشق بنائے جائیں۔ ابھی حال ہی میں گاندھی جی اور لیاقت علی خاں مرحوم گولی کے شکار ہوئے ہیں "طبّی قانونی" نقطۂ نظر سے ضروری تھا کہ ان کا پوسٹ مارٹم کر کے سببِ موت کی تشخیص کی جاتی۔ مگر اس سے احتراز کیوں کیا گیا؟ صرف اس لیے کہ قومی جذبات اپنے محترم لیڈروں کی لاشوں کا چیرنا پھاڑنا برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

دوسری طرف طبّی اور قانونی اغراض کے لیے پوسٹ مارٹم کی ضرورت ہے۔ طب کے مختلف شعبوں کی تعلیم اور طبّی تحقیقات کی ترقی کے لیے اس کی ضرورت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور ایک حد تک قانون بھی اس کا تقاضا کرتا ہے کہ قتل کے مقدمات میں سببِ موت کا تعین کیا جائے۔

اب یہ ایک بڑا پیچیدہ سوال ہے کہ ان دونوں متصادم تقاضوں کے درمیان مصالحت کیسے کی جائے۔ اس کا یہ حل تو میرے نزدیک سخت مکروہ ہے کہ امیروں اور غریبوں، بڑے لوگوں اور چھوٹے لوگوں، خاندان والوں اور لاوارثوں کی لاشوں کے معاملے میں ہمارے پاس دو مختلف معیارِ اخلاق اور دو مختلف طرزِ عمل ہوں۔ اس لیے لامحالہ اس کا کوئی اور ہی حل سوچنا پڑے گا۔ مگر وہ حل کیا ہو، اس باب میں میری قوتِ فیصلہ بالکل عاجز ہے۔ یہ چیز کسی ایسی مجلس میں زیرِ بحث آنی چاہیے جس میں علمائے دین بھی شامل ہوں اور شعبۂ طب اور شعبۂ عدالت کے نمائندے بھی۔ ممکن ہے یہ لوگ سر جوڑ کر اس کا کوئی حل نکال سکیں۔

(۲) الکوہل کے بارے میں مختصر گذارش یہ ہے کہ اس سے مراد وہ الکوہل نہیں ہے جو مختلف قدرتی اشیاء میں بطور ایک جزء کے موجود ہوتی ہے یا کسی خاص مرحلے پر ان کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔

بلکہ وہ الکوہل ہے جو اشیاء میں سے برآمد کر لی جاتی ہے اور ایک نشہ آور مادے کی حیثیت سے قابلِ استعمال ہوتی ہے۔ یہ چیز چونکہ اصل مادۂ نشہ آور (ام الخبائث کی والدہ) ہے، اس لیے اس کا کوئی اندرونی استعمال جائز نہیں ہے، قطع نظر اس سے کہ جس تناسب سے وہ کسی دوا میں ملائی جائے وہ بالفعل نشہ آور ہو یا نہ ہو۔ البتہ اس کے بیرونی استعمال کو جائز رکھا جا سکتا ہے۔

کیا آپ اپنے فن کے نقطۂ نظر سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ کھانے اور پینے کی دواؤں میں کوئی دوسری چیز الکوہل کا بدل نہیں ہو سکتی؟ اور یہ کہ اس کا استعمال بہر حال ناگزیر ہے؟ میرے دوستوں میں ایسے متعدد ڈاکٹر ہیں جنہوں نے الکوہل کے بارے میں میرے نقطۂ نظر کی تائید کی ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ اس کے دوسرے بدل موجود ہیں۔ بلکہ ان میں سے بعض نے تو اندرونی استعمال کی دواؤں میں اس سے کام لینا چھوڑ دیا ہے۔

(۳) شہد کے بارے میں میں نے تفہیم القرآن میں جو کچھ لکھا تھا اُس سے مقصود شہد اور الکوہل کا مقابلہ کرنا نہ تھا۔ میرا مدعا یہ تھا کہ مسلمانوں کے ہاں فن طب کے رواج سے پہلے، جب یہ فن غیر مسلموں کے ہاتھ میں تھا، دواؤں کو محفوظ کرنے کے لیے حرام و حلال کی تمیز کیے بغیر ہر طرح کی چیزیں استعمال کی جاتی تھیں۔ مگر جب یہ فن مسلمانوں کے پاس آیا تو انہوں نے حلال چیزوں کی طرف توجہ کی اور دواؤں کو ان کی مفید صورت میں برقرار رکھنے کے لیے ان کے پاس ایک اہم ذریعہ شہد تھا جو خود بھی ایک مدت تک خراب نہیں ہوتا اور اپنے اندر دوسری چیزوں کو بھی محفوظ رکھتا ہے۔ بعد میں جب یہ فن پھر ایسے لوگوں کے قبضے میں چلا گیا جو حرام و حلال کی تمیز سے واقف نہیں ہیں، تو پھر حرام چیزیں آزادی کے ساتھ استعمال ہونے لگیں جن میں سے ایک نمایاں چیز یہ الکوہل ہے۔

دوسری بات جس سے آپ اتفاق نہیں کر سکے ہیں، دوا سازی کے فن کی تمام ترقیات کے باوجود اِس لائق ہے کہ اہلِ فن اس کی طرف توجہ کریں۔ میرا خیال یہ نہیں ہے کہ سب تدابیر کو چھوڑ کر صرف ایک شہد کی مکھی پر انحصار کر لیا جائے، بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ شہد کی مکھی بھی فن دوا سازی کی ایک اچھی خادم بن سکتی ہے۔

(۴) آدمی کی جان بچانے کے لیے اس کے جسم میں خون داخل کرنا میرے نزدیک تو جائز ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ اس کو حرام کہنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ غالباً اسے خون پینے اور خون کھانے پر قیاس کر کے کسی صاحب نے حرام کہا ہو گا۔ لیکن میرے نزدیک ان دونوں چیزوں میں فرق ہے۔ غذا کے طور پر خون پینا اور کھانا بلاشبہ حرام ہے مگر جان بچانے کے لیے مریض یا زخمی آدمی کے جسم میں خون داخل کرنا اسی طرح جائز ہے جس طرح حالت اضطرار میں مردار یا خنزیر کھانا۔

(۵) مختلف حیوانی دواؤں کے بارے میں جو سوالات آپ نے کیے ہیں ان کا جواب یہ ہے کہ اصولاً ہر وہ چیز حرام ہے جو مردار یا حرام جانور سے حاصل کی جائے، یا حلال جانور کی کسی ناپاک یا حرام چیز سے حاصل کی جائے۔ اور اصولاً ایک حرام چیز کا استعمال صرف اسی صورت میں جائز ہو سکتا ہے جبکہ انسانی جان بچانے کے لیے وہ ناگزیر ہو۔ ان دو اصولوں کو ملحوظ رکھ کر مسلمان اہل فن کو دواؤں کا جائزہ لینا چاہیے اور پھر خود رائے قائم کرنی چاہیے، کیونکہ اپنے فن کو وہ آپ ہی زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ مسلمانوں میں اس وقت جو اہل فن پائے جاتے ہیں وہ نہ محقق، موجد اور مکتشف ہیں اور نہ دوا سازی کی صنعت ہی اُن کے ہاتھ میں ہے۔ ان کی فن دانی اس سے آگے نہیں جاتی کہ دوسروں نے (اور یہ دوسرے وہ ہیں جو کسی کتاب الٰہی اور کسی شریعت نبوی کے پیرو نہیں ہیں) جو کچھ اپنی تحقیق و اکتشاف سے نکالا ہے صرف اُس سے واقف ہو جائیں، اور پھر وہی لوگ جو کچھ جس طرح بنا کر بھیج دیں اسے یہ استعمال کریں۔ یہ بیچارے اس قابل بھی نہیں ہیں کہ انہوں نے اگر کسی مرض کی دوا حرام طریقے سے پیدا کی ہے تو یہ اپنی تحقیق سے اس کا کوئی دوسرا جائز بدل پیدا کر سکیں یا محققانہ طریقے پر کم از کم یہی کہہ سکیں کہ اس کا بدل نہیں مل سکتا اور اس کا استعمال فی الواقع ناگزیر ہے۔ اس حالت میں ہم غیر فنی لوگ محض حلال و حرام کی بحث کر کے آخر کیا مفید خدمت کر سکتے ہیں؟

وھیل مچھلی جائز ہے۔ اسی قسم کی ایک مچھلی صحابہ کرام ایک جنگی سفر کے دوران میں کھا چکے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جائز رکھا ہے۔

(۶) ڈاکٹر کی فیس اصولاً تو جائز ہے، مگر ڈاکٹروں نے بالعموم فیس کے معاملے میں ایسے طریقے اختیار

کرنے شروع کر دیئے ہیں جو گناہ اور ظلم اور سخت فسادت کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ اسی بنا پر ہماری یہ رائے ہے کہ تمام ڈاکٹروں کو اسٹیٹ سے کافی وظیفے ملنے چاہئیں اور انہیں مریضوں کا مفت علاج کرنا چاہیے۔

(۷) سائنس کے مختلف شعبوں کے مطالعے میں اسلام کی رہنمائی کیا ہے، اس سوال کا جواب ایک مفصل مضمون چاہتا ہے، مگر میں مختصراً آپ کو اس کے لیے چند اشارے دیتا ہوں۔

سائنس کا جو شعبہ بھی آپ لیں، وہ بہرحال کائنات کے کسی ایک جز کی ماہیت اور خصوصیات کو اور ان قوانین فطرت کو جو اس میں کارفرما ہیں، مشاہدے اور تجربے کی مدد سے معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اس تحقیق و تجسس میں دو چیزیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک یہ کہ تحقیق کرنے والا انسان پہلے بحیثیت مجموعی پوری کائنات کا (جس کے کسی جز پر وہ اپنی توجہ مرکوز کر رہا ہے) ایک صحیح و جامع تصور رکھتا ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ خود اپنی حقیقت اور حیثیت کو اور اپنے حدود کو ٹھیک ٹھیک سمجھتا ہو۔ ان دو چیزوں کے بغیر الگ الگ اجزاء کی تحقیقات (جو بہرحال صرف تجربہ و مشاہدے میں آنے والے امور واقعیہ تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ کسی نہ کسی فلسفیانہ نظریے کی تشکیل بھی کرتی ہے) مشکل ہی سے کسی صحیح نتیجے پر انسان کو پہنچا سکتی ہے۔ اس کا حاصل، عملی ایجادات سے قطع نظر، فلسفیانہ حیثیت سے اگر کچھ ہے تو یہ کہ ایسی تحقیقات ہمارے مجموعی تصور کائنات، و انسان کو مکمل اور واضح کرنے کے بجائے الٹا ناقص اور مسخ ہی کرتی چلی جائے گی۔

اسلام دراصل ہماری اسی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ وہ ہر قسم کی تحقیقات کے لیے جو نقطۂ آغاز ہم کو دیتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات کو بے خدا فرض کر کے یا بہت سے خداؤں کی رزمگاہ سمجھ کر تحقیق کی ابتدا نہ کرو بلکہ یہ سمجھتے ہوئے اسے دیکھنا شروع کرو کہ یہ ایک خالق کی تخلیق اور ایک قادر مطلق کی سلطنت اور ایک حکیم کی دانائی کا کرشمہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اپنے آپ کو (اور فی الجملہ نوع انسانی کو) غیر محکوم و غیر مسئول، یا مجبور محض، یا مختار کل سمجھتے ہوئے مطالعہ کی ابتداء نہ کرو بلکہ اس حیثیت سے مطالعہ شروع کرو کہ تم سلطنت کائنات میں ایک ایسی رعیت ہو جس کی طرف کچھ اختیارات

منتقل کیا گیا ہے اور اس اختیار کے صحیح و غلط استعمال میں تم مسئول ہو۔

بس یہی ہر مطالعہ و تحقیق کے لیے ایک صحیح نقطۂ آغاز ہے۔ رہے دورانِ تحقیق میں پیش آنے والے وہ بہت سے جزئیات جن سے انسان کو مختلف علمی شعبوں میں سابقہ پیش آتا ہے، تو اُن میں اسلام اس کے سوا کسی بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ ہمارے اخذ کردہ نتائج اُن حقائق سے نہ ٹکرائیں، جن کی صراحت کتاب اللہ میں پائی جاتی ہو۔ اگر بالفرض کسی جگہ بعض حقائق مشہودہ (Observed facts) سے ہم کو ایسے نتائج نکلتے نظر آئیں جو تصریحاتِ کتاب سے متصادم ہوتے ہوں، تو پھر ہمیں غور سے دیکھنا چاہیے کہ کہیں ہمارے مشاہدے یا طریقۂ استنتاج میں تو کوئی غلطی نہیں ہے۔ یہ خیال رہے کہ تصادم اگر ہو سکتا ہے تو حقائق و واقعات اور تصریحاتِ کتاب میں نہیں بلکہ نتائج مستخرجہ اور تصریحاتِ کتاب میں ہو سکتا ہے، اور اس صورت میں نظر ثانی کتاب پر نہیں بلکہ نتائج مستخرجہ پر ہونی چاہیے، کیونکہ نتائج مستخرجہ حقائقِ مشہودہ کی طرح کوئی یقینی چیز نہیں ہیں۔

اِن اصولی باتوں کو سمجھنے کے بعد اب اپنی تحقیق کا راستہ تلاش کرنا آپ کا اپنا کام ہے۔

(۸) دواؤں اور غذاؤں میں کیا چیزیں پاک ہیں اور کیا ناپاک، اس کو جاننے کے لیے آپ کو کچھ نہ کچھ حدیث اور فقہ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ جہاں تک احکامِ قرآنی کا تعلق ہے اس سلسلے میں آپ کو تفہیم القرآن سے کافی مدد مل جائے گی۔ مگر پھر بھی حدیث اور فقہ کے مطالعے کی ضرورت باقی رہتی ہے تاکہ آپ اصولی احکام سے بھی واقف ہو جائیں اور جزئی مسائل سے بھی۔ افسوس ہے کہ ہمارے ہاں اب تک میڈیکل کالج کی تعلیم میں شرعی احکام کی تعلیم شامل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی ہے۔ آخر ہم کیسے اس چیز کی ضرورت محسوس کر لیں جسے ہمارے استاد (انگریز) نے غیر ضروری سمجھا تھا!

(۹) مسلم حکماء نے فنِ طب کو کس طرح مسلمان بنایا تھا، اس مسئلے پر تفصیلی گفتگو تو کوئی صاحبِ علم طبیب ہی کر سکتا ہے۔ میں اس کے متعلق صرف ایک مجمل بات ہی کہہ سکتا ہوں کہ ابتدائی دور کے مسلم حکماء نے محض اندھے مقلدوں کی طرح اِس فن کو غیر مسلم استادوں سے جوں کا توں نہیں لے لیا تھا بلکہ اسے مشرف باسلام کیا تھا اور اُن کا یہ کارنامہ محض نسخوں پر "ہوالشافی" لکھ دینے تک محدود نہ تھا۔ انہوں نے

فنِ طب میں جو کتابیں لکھیں اُن کو دیکھیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ خدا پرست لوگوں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں جو خدا کی حمد اور رسول پر درود و سلام سے کلام کی ابتدا کرتے ہیں اور بیچ بیچ میں جگہ جگہ خدا کی حکمت اور قدرت اور اس کی شانِ تخلیق اور آفاق و انفس میں اس کی آیات کی طرف اشارے کرتے جاتے ہیں۔ ان کی کتابوں کا حال موجودہ زمانے کی طبی کتابوں کا سا نہیں ہے جن میں کہیں اشارے کنایے میں بھی خدا کا ذکر نہیں آتا۔ اس سے فرق یہ واقع ہوتا ہے کہ پہلے ایک طالب علم کے ذہن میں تشریحِ بدن اور وظائف اعضاء اور اسبابِ امراض اور خواصِ ادویہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ خدا پر یقین اور اس کے خالق اور حکیم اور مدبر ہونے پر اعتقاد بڑھتا جاتا تھا، اور اب یہی ساری چیزیں پڑھنے کے دوران میں ایک خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نظر آپ سے آپ پرورش پاتا چلا جاتا ہے، الّا یہ کہ کوئی طالب علم باہر کہیں سے ایمان باللہ ساتھ لایا ہوا ہو، یہاں اناٹومی اور فزیالوجی وغیرہ پڑھتے ہوئے وہ بطورِ خود آیاتِ الٰہی کا مشاہدہ بھی کرتا ہے۔

قدیم زمانے میں ہمارے حکماء نے یہ طریقہ مقرر کر رکھا تھا کہ فنِ طب کی تعلیم علومِ دینی کی تکمیل کے بعد دی جاتی تھی۔ ایک طالب علم مدرسۂ طب میں آتا ہی اس وقت تھا جب وہ ملک کی عمومی ثانوی تعلیم سے فارغ ہو چکا ہو، اور اس ثانوی تعلیم کا جزوِ لازم علمِ دین ہوتا تھا۔ اس لیے ہمارے ہاں کے طبیب نرے طبیب ہی نہ ہوتے تھے بلکہ عالمِ دین بھی ہوتے تھے۔ اب معاملہ اِس کے برعکس ہے کہ میڈیکل کالج کے درجۂ فراغ کو پہنچا ہوا ایک طالب علم حدودِ حلال و حرام کی ابتدائی معلومات تک نہیں رکھتا۔

مزید براں ہمارے پرانے زمانے کے اطباء بالعموم زاہد و عابد لوگ ہوتے تھے، لالچ کے بغیر خدمتِ خلق کرتے تھے، فیس لینے سے اکثر اور دو افروشی سے کلیتہً اجتناب کرتے تھے، اور ان کی ذاتی زندگی بڑی پاکیزہ ہوتی تھی۔ اس لیے طبی تعلیم کا سارا ماحول پاک اور دیندارانہ رہتا تھا اور استادوں کے عمدہ اوصاف خود بخود شاگردوں میں سرایت کر جاتے تھے، بغیر اس کے کہ طلبہ کو دیندار اور با اخلاق بنانے کے لیے کوئی مصنوعی کوشش کرنی پڑتی۔

اس کے ساتھ دوا سازی کے فن کی جو اصلاح اُن لوگوں نے کی اس کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔ وہ لوگ حرام چیزوں کو صرف اسی صورت میں استعمال کرتے تھے جبکہ مریض کے علاج کے

لیے ان کا استعمال ناگزیر ہو۔ ورنہ بالعموم انہوں نے اپنی دعاؤں کو حرام اور ناپاک اجزاء سے پاک رکھا تھا۔

انسان کے "فطرت" پر پیدا ہونے کا مفہوم

سوال۔ حدیث کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ کا کیا مطلب ہے۔ اس سوال کا باعث آپ کی کتاب خطبات کی وہ عبارت ہے جس میں آپ نے خیال ظاہر کیا ہے کہ "انسان ماں کے پیٹ سے اسلام لے کر نہیں آتا" اس حدیث کا مطلب عموماً یہ لیا جاتا ہے کہ ہر بچہ مذہب اسلام پر پیدا ہوتا ہے، مگر آپ کی مذکورۂ بالا عبارت اس سے ابا کرتی ہے۔ آپ کی اس عبارت کو دیگر معترضین نے بھی بطورِ اعتراض لیا ہے، مگر میں اس کا مطلب کسی اور سے سمجھنے یا خود نکالنے کے بجائے آپ ہی سے سمجھنا چاہتا ہوں، کیونکہ متعدد بار ایسا ہوا ہے کہ معترض نے آپ پر اعتراض کر دیا اور بادی النظر میں اس کا اعتراض معقول معلوم ہوا، مگر جب آپ کی طرف سے اس عبارت کا مفہوم بیان ہوا تو عقل سلیم نے آپ کے بیان کردہ مفہوم کی تصدیق کی۔"

جواب:۔ اس حدیث میں جو حقیقت بیان ہوئی ہے وہ دراصل یہ ہے کہ انسان خدا کے ہاں سے کفر یا شرک یا دہریت لے کر نہیں آتا بلکہ وہ خالص فطرت لے کر آتا ہے جو خدا کے سوا اپنے کسی معبود کو نہیں جانتی اور شرائع الٰہیہ کے فطری اصولوں کے سوا کسی چیز سے مانوس نہیں ہوتی۔ اگر اس فطرت پر آدمی برقرار رہے اور کوئی بگڑا ہوا ماحول اسے مشرکانہ افکار و اعمال اور گمراہانہ اخلاق و اوصاف کی طرف نہ موڑ دے تو اسے انبیاء علیہم السلام کی پیش کردہ تعلیمات کو قبول کرنے میں ذرا تامل نہ ہو۔ وہ اس چیز کو اس طرح لے جیسے اس کی اپنی چیز تھی جو کسی نے لا کر اسے دے دی۔

لیکن یہ حقیقت کا صرف ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ "اسلام" جس چیز کو کہتے ہیں وہ کسی آدمی کو خود بخود حاصل نہیں ہو جاتی بلکہ صرف انبیاء علیہم السلام کے واسطے سے ہی ملتی ہے، اور

ایک آدمی مسلم اسی وقت ہوتا ہے جبکہ انبیاء کے پیش کردہ دین کو جان کر دل سے اس کی تصدیق کرے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص سنِ شعور کو پہنچنے تک ٹھیک ٹھیک اُسی فطرت پر قائم ہو جس پر اللہ نے اسے پیدا کیا تھا، تب بھی اس کا مسلم ہونا اسی پر موقوف ہوگا کہ نبی کے واسطے سے اس کو دین ملے اور وہ اسے قبول کرے۔ جو شخص اس بات کو نہیں مانتا وہ دراصل یہ کہتا ہے کہ آدمی ماں کے پیٹ سے جو فطرت لے کر آتا ہے وہی پورا کا پورا اسلام ہے اور وہی آدمی کے ہدایت یافتہ ہونے کے لیے کافی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ شرائع کا نزول اور انبیاء کی آمد بالکل غیر ضروری ہے۔ حالانکہ قرآن جس بات کو بار بار وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کو بہرحال خدا کی طرف سے ایک رہنمائی کی ضرورت ہے اور وہ ہر شخص کو براہِ راست نہیں بلکہ انبیاء کے واسطے سے ہی مل سکتی ہے، اور اسی کا اتباع قبول کرنے پر آدمی کی نجات کا مدار ہے۔ دیکھیے، جس وقت کوئی اجتماعی ماحول سرے سے موجود نہ تھا اور کسی یہودیت یا نصرانیت یا مجوسیت کا نام و نشان تک نہ تھا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسانی کو خطاب کر کے فرمایا:

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (البقرہ - ۴)

پس اگر میری طرف سے تمہارے پاس رہنمائی آئے تو جو لوگ میری رہنمائی کی پیروی کریں گے اُن پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی جس فطرت کو اللہ نے فجور اور تقویٰ کی ایک الہامی معرفت بخشی ہے وہ اگر اپنی سلیم حالت میں بھی محفوظ ہو، پھر بھی وہ خود راستہ پا لینے کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے وحی کی رہنمائی ناگزیر ہے۔ فطرت کی صلاحیت زیادہ سے زیادہ بس اتنی ہی ہے کہ وحی کے ذریعہ سے جب اس کے سامنے راہِ حق پیش کی جائے تو وہ اسے پہچان لیتی ہے اور اس کی تصدیق کرتی ہے، مگر وحی کے بغیر خود راہ یاب ہو جانا اس کے بس میں نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر سلیم الفطرت آخر کون ہو سکتا ہے؟ آپ کا حال یہ تھا کہ جب تک وحی نے رہنمائی نہ کی، آپ ٹھٹکے کھڑے تھے اور کچھ نہ جانتے تھے کہ راستہ کدھر ہے۔ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی۔ اور

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا، مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ -

اِس اسلام کے متعلق آخر کوئی صاحبِ علم و عقل آدمی یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ یہ مسلمان گھر میں پیدا ہونے والے ہر آدمی کو آپ سے آپ مل جاتا ہے اور اس کے حاصل ہونے کے لیے سرے سے کسی علم و شعور اور ارادی تصدیق کی حاجت ہی نہیں ہے ؟

منگنی کا شرعی حکم

سوال :- کیا شرعی لحاظ سے خطبہ نکاح کا حکم رکھتا ہے ؟ عوام اس کو ایجاب و قبول کا درجہ دیتے ہیں ۔ اگر لڑکی کے والدین ٹھیری ہوئی بات کو رد کر دیں تو برادری میں ان کا مقاطعہ تک ہو جاتا ہے ۔ اس صورت میں اگر والدین اس لڑکی کا نکاح دوسری جگہ کر دیں تو کیا یہ فعل درست ہو گا ؟

جواب :- منگنی محض ایک قول و قرار ہے اِس بات کا کہ آئندہ اس لڑکی کا نکاح فلاں شخص سے کیا جائے گا ۔ یہ بجائے خود نکاح نہیں ہے ۔ البتہ فریقین کے درمیان ایک طرح کا عہد و پیمان ضرور ہے جس سے پھر جانا درست نہیں ، اِلّا یہ کہ اس کے لیے کوئی معقول وجہ موجود ہو ۔ اگر منگنی کے بعد فریقین میں سے کسی ایک پر دوسرے کا کوئی ایسا عیب ظاہر ہو جو پہلے معلوم نہ تھا یا چھپایا گیا تھا ، تو بلا شبہ اس قول و قرار کو ختم کیا جا سکتا ہے ۔ لیکن اس طرح کی کسی معقول وجہ کے بغیر یونہی اسے ختم کر دینا ، یا کسی غیر معقول وجہ کی بنا پر اس سے پھر جانا ہرگز جائز نہیں ۔ دوسری بدعہدیوں کی طرح یہ بھی ایک بدعہدی ہے جس پر انسان خدا کے ہاں جواب دہ ہو گا ۔

اِستمنا بالید کا شرعی حکم

سوال ۔ ایک شخص کا شباب عروج پر ہے ، نفسانی جذبات کا زور ہے ۔ اب ان جذبات

کو قابو میں رکھنے کی چند ہی صورتیں ہو سکتی ہیں :-

یہ کہ وہ نکاح کرے، مگر جس لڑکی سے اس کی نسبت ہے وہ اتنی چھوٹی ہے کہ کم از کم تین چار سال انتظار کرنا ہوگا۔

یہ کہ وہ اپنے خاندان سے باہر کہیں اور شادی کر لے۔ مگر ایسا کرنے سے تمام خاندان ناراض ہوتا ہے بلکہ بعید نہیں کہ اس کا اپنے خاندان سے رشتہ ہی کٹ جائے۔

یہ کہ وہ اس نیت سے کوئی عارضی نکاح کرے کہ اپنی خاندانی مخطوبہ سے شادی ہو جانے کے بعد پہلی بیوی کو طلاق دے دیگا، مگر اس میں اور متعہ میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

یہ کہ وہ اپنی خواہشات کو قابو میں رکھنے کے لیے مسلسل روزے رکھے۔ مگر وہ ایک محنت پیشہ آدمی ہے جسے تمام دن مشغول رہنا پڑتا ہے۔ اتنی محنت روزوں کے ساتھ سخت مشکل ہے۔

آخری چارۂ کار یہ ہے کہ وہ زنا سے بچنے کے لیے نکاح بالید سے کام لے۔ کیا ایسے حالات میں وہ اس طریقے کو اختیار کر سکتا ہے؟

جواب :- نکاح بالید، یعنی ہاتھ سے شہوت رفع کرنے کے بارے میں فقہاء اسلام کے تین مسلک ہیں :-

(۱) یہ کہ وہ مباح ہے اور زیادہ سے زیادہ اگر اس کے خلاف کچھ کہا جا سکتا ہے تو صرف اس قدر کہ مکارم اخلاق کے خلاف ہونے کی وجہ سے وہ ایک مکروہ اور ناپسندیدہ فعل ہے۔ اس مسلک کے حامی دلیل یہ دیتے ہیں کہ کسی نص میں اس فعل کے حرام ہونے کی تصریح نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ (اللہ نے جو کچھ تم پر حرام کیا ہے اس کو وہ تمہارے لیے مفصل بیان کر چکا ہے)، لہٰذا جب محرمات کی تفصیل میں یہ مذکور نہیں ہے تو حلال ہے۔ ابن حزم نے محلّٰی میں اس رائے کو پورے دلائل کے ساتھ بیان کیا ہے، اور سند کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ حسن بصری، عمرو بن دینار اور مجاہد اس کی اباحت کے قائل تھے، اور عطاء اس کو صرف مکروہ سمجھتے تھے (ج ۱۱ ص ۹۳-۳۹۲)۔ علامہ آلوسی نے روح المعانی میں امام احمد ابن حنبل کی یہ رائے نقل کی ہے کہ "یہ فعل

عند الضرورت اُسی طرح جائز ہے جیسے فصد اور پچھنے" (ج ۱۸ - ص ۱۰)۔ لیکن مجھے فقہ حنبلی کی کسی مستند کتاب میں یہ فتویٰ نہیں ملا۔

(۲) یہ کہ وہ حرام ہے، لیکن اگر زنا کے فتنے میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو اور آدمی اس سے بچنے کے لیے اس طریقے سے شہوت کی تسکین کر لے تو امید ہے کہ اسے سزا نہ دی جائے گی۔ یہ رائے حنفیہ کی ہے چنانچہ رد المحتار میں تصریح ہے کہ یہ فعل حرام اور مستلزم سزا ہے، الّا یہ کہ اگر زنا کے اندیشے سے کوئی اس کا ارتکاب کرے تو یُرجیٰ اَلّا وبال علیہ (باب الصوم - اور باب الحدود)۔ اسی کے قریب علامہ آلوسی نے ابن ہمام کا قول نقل کیا ہے (حوالۂ مذکور)، اور اسی سے ملتی جلتی رائے علامہ ابن عابدین نے فقیہ ابو اللیث سے نقل کی ہے۔ اس رائے کے حق میں کوئی خاص نص نہیں ہے، بلکہ یہ اسلام کے اصولِ عامّہ سے مستنبط کی گئی ہے، مثلاً حالتِ اضطرار میں حرام شے کے استعمال کی اجازت، اور دو ناجائز کاموں کے ناگزیر ہو جانے کی صورت میں کم تر درجے کے ناجائز کو اختیار کرنے کا قاعدہ۔

(۳) یہ کہ وہ قطعاً حرام ہے۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کی یہی رائے ہے، اور وہ سورۂ مومنون کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ، فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ۔	اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، بجز اپنی بیویوں کے اور اُن عورتوں کے جو ان کی ملک یمین میں ہوں، کہ (ان سے پرہیز نہ کرنے میں) وہ قابلِ ملامت نہیں ہیں۔ پھر جو اس کے سوا کوئی اور راہ (قضائے شہوت کی) تلاش کرے تو ایسے ہی لوگ زیادتی کرنے والے ہیں۔

اس آیت سے وہ استدلال کرتے ہیں کہ منکوحہ بیوی اور ملک یمین میں آئی ہوئی لونڈی کے سوا تسکینِ شہوت کی تمام صورتیں از روئے قرآن حرام ہیں، خواہ وہ زنا ہو، یا استمنا بالید، یا عملِ قومِ لوط، یا وطیٔ بہائم، یا کچھ اور۔ پھر اسی کی تائید یہ احادیث بھی کرتی ہیں:-

ناکح الید ملعون۔	اپنے ہاتھ سے نکاح کرنے والا ملعون ہے۔

عذب اللہ تعالیٰ امۃ کانوا یعبثون بمذاکیرھم ۔

اللہ نے ایسے لوگوں کو عذاب دیا جو اپنے اعضائے جنسی سے کھیلتے تھے ۔

یہ دونوں حدیثیں علامہ آلوسی نے روح المعانی میں نقل کی ہیں ۔ ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں ایک اور حدیث نقل کی ہے مگر ساتھ ہی یہ تصریح بھی کر دی ہے کہ یہ حدیث غریب ہے، نیز اس کی سند میں ایک راوی غیر معروف ہے :

سبعۃٌ لا ینظرُ اللہُ الیھم یوم القیامۃ ولا یزکیھم ولا یجمعھم مع العالمین و یُدخِلُھم النّارَ فی اوّل الداخلین الا ان یتوبوا ومن تاب تاب اللہ علیہ ۔ الناکح یدہ، والفاعل والمفعول بہ، و مدمنُ الخمر، والضاربُ وَالِدَیْہ حتّٰی یَستغیثا، والمؤذی جیرانہ حتی یلعنوہ، والناکحُ حلیلۃَ جارِہٖ ۔

سات آدمی ہیں جن کی طرف اللہ قیامت کے روز نظر نہ فرمائے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا اور نہ انہیں دوسرے لوگوں کے ساتھ جمع کرے گا اور سب سے پہلے دوزخ میں داخل ہونے والوں میں شامل کریگا، اِلّا یہ کہ وہ توبہ کر لیں اور جو توبہ کرے اللہ اسے معاف کر دیتا ہے ۔ (۱) اپنے ہاتھ سے نکاح کرنے والا ۔ (۲) عمل قوم لوط کرنے والا ۔ (۳) یہ فعل کرانے والا ۔ (۴) عادی شراب خور (۵) اپنے والدین کو مارنے والا یہاں تک کہ وہ فریاد کریں (۶) اپنے ہمسایوں کو ستانے والا یہاں تک کہ وہ اس پر لعنت کریں (۷) اپنے ہمسائے کی بیوی سے بدکاری کرنے والا ۔

ان مختلف مسلکوں اور ان کے دلائل پر نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ پہلا مسلک نہایت کمزور، بلکہ غلط ہے ۔ اس لیے کہ قرآن میں حرام چیزوں کی تفصیل ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ سب حرام چیزوں کو نام بنام بیان کیا گیا ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں حرام و حلال کے کلّی اصول بیان کر دیے گئے ہیں ۔ پس ہر وہ چیز جو قرآن کے بیان کردہ کسی کلیہ کے تحت آتی ہو اس پر وہی حکم جاری ہو گا جو کلیہ میں ارشاد ہوا ہو، اِلّا یہ کہ اس کو مستثنیٰ قرار دینے کے لیے کوئی دلیل موجود ہو ۔ اب سوال یہ ہے کہ جب قرآن یہ عام قاعدہ بیان کر چکا ہے کہ بیویوں اور مملوکہ عورتوں کے سوا قضاءِ شہوت کے تمام طریقے عدوان ہیں،

تو اس سے نکاح بالید کے مستثنیٰ ہونے کی آخر دلیل کیا ہے؟ اس کے جواب میں بعض لوگوں نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ "عرب میں اس فعل کا کوئی رواج نہ تھا، نہ کلامِ عرب میں اس کا کوئی ذکر ہے، لہٰذا فمن ابتغی وراء ذالک میں یہ داخل نہیں ہے"۔ لیکن یہ دلیل دو وجوہ سے غلط ہے۔ ایک یہ کہ لغتِ عرب میں اس کے لیے جَلد عُمیرہ اور خَضْخَضَہ کے الفاظ موجود ہیں، اور زبان میں کسی لفظ کا موجود ہونا اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ اہلِ زبان اس تصور سے آشنا تھے۔ دوسرے یہ کہ اگر عرب اس سے واقف نہ تھے تو خدا تو انسانوں کے سب افعال سے واقف تھا۔ اس کے بیان کردہ کلیات صرف انہی جزئیات تک آخر کیسے محدود ہو جائیں گے جن سے اُس زمانے کے عرب واقف ہوں۔

اِن دلائل کی بنا پر صحیح مسلک یہی ہے کہ یہ فعل حرام ہے۔ البتہ عقل یہ حکم لگاتی ہے کہ اس کی حرمت زنا، اور عملِ قومِ لوط اور وطیِ بہائم کی بہ نسبت کم تر ہے۔ اس لیے اگر کسی شخص کو اِن گناہوں میں سے کسی ایک میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو اور اس سے بچنے کے لیے وہ اپنے جوشِ طبع کی تسکین اس ذریعے سے کر لے تو اس کے حق میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ "شاید اللہ تعالیٰ اسے معذور رکھے"۔

اب اُس خاص شخص کا مسئلہ لیجیے جس کے بارے میں سوال کیا گیا ہے۔ اس کو پہلے تو میں اللہ تعالیٰ کی یہ نصیحت یاد دلاؤں گا کہ

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّىٰ يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ۔ (النور-۴)	اور چاہیے کہ وہ لوگ باعفت رہنے کی کوشش کریں جو نکاح کا موقع نہیں پاتے یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے۔

پھر میں اس سے صاف کہوں گا کہ تمہارے معاملے میں وہ حالت ہرگز موجود نہیں ہے جسے تم ایک حرام چیز کو حلال کرنے کے لیے معذرت کے طور پر پیش کر رہے ہو۔ تم محض اپنے خاندان کے خوف سے نکاح نہیں کرتے، حالانکہ اس خاندان نے ایک جوان آدمی کو ایک کم سن لڑکی کے ساتھ منسوب کر کے اپنی نادانی کا پورا ثبوت دے دیا ہے۔ اب اگر تم نکاح کے مواقع پاتے ہو مگر خاندان کی ناراضی

سے ڈر کر نہیں کرتے تو خواہ تم کوئی سا گناہ بھی کرو، خدا کے ہاں ضرور ماخوذ ہوگے، کیونکہ حقیقی مجبوری تمہیں کوئی نہیں ہے۔ حجتیں ڈھونڈھنے کے بجائے سیدھی طرح فیصلہ کرو کہ خوف کا مستحق کون زیادہ ہے؟ خدا یا خاندان؟

عذرِ شرعی کی تشریح

سوال: - عذرِ شرعی کے متعلق کوئی واضح حدود مقرر ہیں یا یہ حالات اور مواقع کے مطابق بدلتے رہتے ہیں؟ جماعتی کاموں میں حصہ لینے کے لیے کچھ رفقا اس بنا پر سفر نہیں اختیار کرتے کہ انہیں اپنے روزگار سے علیحدہ ہونے کا ڈر ہے جس میں مسجد کی امامت بھی شامل ہے۔ لہٰذا عذرِ شرعی کی جامع سی تعریف سے مطلع فرمائیں۔

جواب - عذرِ شرعی کی کوئی جامع اور مانع تعریف جس کے بعد کسی بحث و نزاع کی گنجائش ہی باقی نہ رہے بہت مشکل ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کے کچھ حدود ہی معین نہیں ہیں اور ہر قسم کے لچر اور جھوٹے عذرات کو عذرِ شرعی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ شریعت کے کتنے احکام ہیں جن کے بارے میں اللہ اور رسولؐ نے خود تصریح کے ساتھ وہ عذرات بیان کر دیے ہیں جن کی موجودگی میں آدمی یا تو ان احکام کی ذمہ داریوں سے بری ہو جاتا ہے یا کم از کم ان کی نوعیت تبدیل ہو جاتی ہے۔ مثلاً خوف، بیماری اور سفر کی حالت میں نماز کا حکم۔ پانی نہ ملنے یا بیمار ہونے کی صورت میں وضو کا حکم۔ عدمِ استطاعت کی حالت میں حج کا حکم۔ بیماری اور سفر وغیرہ صورتوں میں روزے کا حکم۔ ضروری سامانِ جہاد فراہم نہ ہو سکنے کی صورت میں جہاد کا حکم۔

ان تمام صورتوں میں شریعت نے جن چیزوں کو عذرِ شرعی کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے بعض حالات میں ان کے واقعی اور غیر واقعی ہونے پر بحث ہو سکتی ہے اور ایک کمزور ایمان کا آدمی بالکل غیر واقعی عذرات کو بھی شریعت کی ذمہ داریوں سے بچنے کے لیے بہانہ بنا سکتا ہے، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ

ان کے حدود بالکل غیر معیّن اور مجہول ہیں۔ بڑی آسانی کے ساتھ دو معقول آدمی ایک شخص کے عذرات کو سُن کر اور اس کی مجبوریوں کو معلوم کر کے یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ فی الواقع وہ ایک حکم شرعی کی تعمیل سے معذور ہے یا محض ٹال مٹول کر رہا ہے۔

یہ تو آپ کی بات کا اصولی جواب ہُوا اب خاص جماعت کے معاملے کو لیجیے۔

جماعت کا ہر رکن حدودِ شریعت کے اندر امیرِ جماعت اور اس کے مقرر کیے ہوئے امرا کی اطاعت کا عہد کرتا ہے۔ اس عہد کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ امیرِ جماعت اور اس کے مقرر کیے ہوئے امرا حدودِ شرع کے اندر جس بات کا حتمی طور پر حکم دیں اس کی اطاعت کی جائے، الّا آنکہ کوئی ایسا عذر معقول ہو جس کو شریعت میں عذر تسلیم کیا گیا ہو، یا جس کو شریعت کی روشنی میں عذر تسلیم کیا جا سکتا ہو۔ مثلاً بیماری، یا عدمِ استطاعت، یا وسائلِ کار کی عدم موجودگی، یا پیشِ نظر کام کے مقابل میں کسی بڑے مقصد یا کام کے نقصان کا اندیشہ وغیرہ۔ اس طرح کی بہت سی باتیں ہو سکتی ہیں، جو عذر بن سکتی ہیں اور جن کی بنا پر کسی شخص کو جماعت کی بعض ذمہ داریوں سے سبک دوش قرار دیا جا سکتا ہے۔ اِس سلسلے میں خاص طرح کے لوگوں کے بعض خاص حالات بھی ایسے ہو سکتے ہیں جو ان کے لیے عذر بن سکتے ہیں۔ مثلاً جو لوگ تعلیمی مشغولیتوں میں مصروف ہیں، یا ملازمت کی پابندیوں میں بندھے ہوئے ہیں، جماعت کی بعض ذمہ داریوں کے ادا کرنے سے واقعی مجبور ہوتے ہیں اور یہ ضروری ہوتا ہے کہ ان کا لحاظ کیا جائے۔ بعض خاص حالات میں مسجد کی امامت بھی عذر بن سکتی ہے، مثلاً یہ کہ امام مسجد کو جس کام کے لیے بھیجا جا رہا ہے اس کی دینی مصلحت، اس کے فرائضِ امامت کے مقابل کم تر ہو۔

اس قسم کے جتنے اختلافات پیدا ہوں، یعنی جہاں یہ سوال سامنے آئے کہ فی الواقع عذر کرنے والے کا عذر معقول ہے یا نہیں، تو اس کا تصفیہ میرے خیال میں ہر حلقے کے امیر اور اس کی مجلس شوریٰ کو کرنا چاہیے۔ وہ سارے سارے حالات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ عذر کرنے والے کا عذر معقول ہے یا نہیں۔ اور اس بات کو یاد رکھیے کہ میرے نزدیک ہر معقول عذر عذرِ شرعی کی حیثیت رکھتا ہے۔